جناب محمد فاضل بلوچ

جنوبی ایشیا میں عہد سلاطین کے کتب خانے

بنی نوع انسان کے جدِ اعلیٰ سیدنا آدم علیہ السلام کو فرشتوں جیسی پاکیزہ مخلوق پر محض علم کی وجہ سے فوقیت و فضیلت بخشی گئی اور خلیفۃ اللہ فی الارض کا اعزاز عطا کیا گیا۔ لہٰذا اولادِ آدم میں سے جس فرد اور قوم نے علم کے اس ورثے کو جس قدر پایا اسی قدر عروج حاصل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ بامِ عروج پر پہنچنے والی تمام اقوام و ملل نے اس مقدس امانت کو آنے والی نسلوں تک پہنچانے کے لیے اپنے اپنے ادوار میں شان دار کتب خانے قائم کیے اور یوں رفتہ رفتہ کتب خانے الہامی اور اکتسابی علوم کے خزینے بنتے چلے گئے۔ خود اسی وسط ایشیا میں نالندہ یونیورسٹی کی ایک عظیم الشان لائبریری تھی جو تین عمارات میں واقع تھی۔ یہ عمارات رتنا ساگرہ، رتنو دادھی اور رتنا رنجکا کے نام سے موسوم تھیں۔ رتنو دادھی نو منزلہ عمارت تھی جس میں مقدس مخطوطات (از قسم) پرجنا پرمیتا اور تانترک۔ پوری لائبریری جو تین بڑی عمارات پر مشتمل تھی، دھرم گنج (DARMAGANJA) کے نام سے مشہور تھی۔ لیکن "تصنیف و تالیف" اور علمی ذخیروں کا مرتب و محفوظ رکھنا مسلمانوں کا قومی شعار تھا اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے عہد میں جس کثرت سے کتب خانے اور دار العلم پائے جاتے تھے، شاید دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی،

ہمو ایمرڈی جانسن جیسا متعصب (جس کے نزدیک "اسلام زیادہ تر فوجی طاقت کے بل بوتے پر پھیلا اور مسلمانوں میں کچھ رہنما ایسے گزرے ہیں جو بجز قرآن کسی کتاب کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے") وہ بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ "دنیائے اسلام عموماً کتاب پسند واقع ہوئی ہے اور کتابوں کو مسلمانوں کے ہاں جو مقام حاصل ہے شاید ہی دنیا کی تاریخ اس کی کوئی مثال پیش کر سکے یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے عروج کے زمانے میں جہاں بغداد عروسِ علم تھا وہاں قرطبہ "اللہ کی زمینوں میں سے سب سے زیادہ کتب رکھنے والا تھا۔"[1] لیکن جب کوئی قوم اقتدار پر فائز ہونے کے باوجود

---

[1] المقری، نفح الطیب (مصر، مطبع عیسٰی البابی الحلبی، ۱۹۳۶ء) ص ۳۰۵

صداقت، شرافت اور عدالت کا دامن چھوڑ کر اخلاقِ رذیلہ میں مبتلا ہو جاتی ہے تو ایسے مواقع پر اللہ تعالیٰ کی یہ سنت رہی ہے کہ وہ اُسے بامِ ثریا سے تحت الثریٰ پر دے مارتا ہے۔ ملّتِ بیضا بھی جزوی طور پر اسی سنتِ الٰہی کی مستحق ٹھہری لیکن یہ اس اُمّت کی خوش نصیبی تھی کہ اس نے اس حادثہ کبریٰ کو اپنے لیے وجہ تنبیہ سمجھا اور پھر جہاں جہاں پہنچی، وہاں اخلاقِ عالیہ کے فروغ کے لیے علوم و فنون کی بساط بچھادی۔ ان کی تصنیف شدہ کتب سے یورپ کے کتب خانے آج بھی مزین ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ جب مسلمان ہندوستان میں بحیثیت فاتح داخل ہوئے تو ہندوؤں میں علم نحو، ریاضی، طب اور علم نجوم مروج تھے۔ ان متداولہ علوم میں سے علم نجوم کو برتر سمجھا جاتا تھا کیوں کہ ان کے دینی معاملات کا اس علم کے ساتھ گہرا تعلق تھا۔[7] لیکن جہاں علم کی دولت پر کسی ایک طبقے کی اجارہ داری قائم ہو جائے تو اس سے بڑھ کر ننگِ انسانیت اور مکروہ فعل کوئی نہیں ہو سکتا۔ لیکن بدقسمتی سے اس زمانے میں ہندو من حیث القوم اسی بلا میں گرفتار تھے۔ اس کی گواہی ان کے اپنے مصنف بھی دیتے ہیں۔ چنانچہ مشہور ہندو مورخ جادو ناتھ سرکار لکھتے ہیں کہ کتابوں کو نقل کر کے تقسیم کرنے اور علم کی عام اشاعت کے لیے ہم اسلامی اثرات کے ممنون ہیں، ورنہ ہندو مصنفین تو اپنی لکھی ہوئی کتابوں کو ہمیشہ پوشیدہ رکھنے کے شیدائی تھے۔[8] مسلمانوں نے اشاعتِ علم کے لیے شروع ہی سے مساجد، خانقاہیں اور کتب خانے قائم کیے۔ لیکن تاریخ کی کتابوں میں ان کے کتب خانوں کا ذکر عموماً اس لیے نہیں ملتا کہ ہندوستان کے قدیم مسلمان حکمران کتب خانوں کے لیے الگ عمارات نہیں بنواتے تھے۔ بلکہ تعلیمی ادارے، مساجد اور خانقاہیں ہی ایسی جگہیں تھیں جہاں کتابوں کو محفوظ کیا جاتا تھا۔ مقدسی کے الفاظ میں "الاسلام عندھم طراوۃ والعلم واھلہ کثیر"[9] یعنی ان کے ہاں اسلام تر و تازہ ہے، علم اور اہلِ علم کی کثرت ہے۔ محمد بن قاسم کی فتح کے بعد سندھ پر عربوں نے اڑھائی سو برس سے کچھ زائد عرصے تک حکومت کی۔[10]

---

[7] ابو ریحان البیرونی۔ کتاب الہند ترجمہ (لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء) ص ۱۸۴، ۱۸۵۔

[8] محمد زبیر۔ اسلامی کتب خانے (دہلی، ندوۃ المصنفین، جامع مسجد، ۱۹۶۱ء) ص ۱۴۸ بحوالہ جادو ناتھ سرکار انڈیا تھرو دی ایجز۔

[9] تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند (لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۲ء) جلد ۱ (عربی ادب) ص ۲۵۔

اس دور میں سندھ کے شہر منصورہ اور دیبل، عراق کے شہر بغداد و بصرہ کی مانند اسلامی علوم و فنون کے مرکز تھے اور گھر گھر دار العلوم بنا ہوا تھا[۵۵] لیکن صحیح معنوں میں اسلامی حکومت کے قدم سرزمین ہند میں سلطان محمود غزنوی کی مجاہدانہ مساعی کی بدولت جمے، امن و امان قائم ہوا، اور علما کے ہاتھوں میں کتاب و قلم نظر آنے لگے[۵۶]۔ اب ہم ذیل میں صرف ان سلاطین، امرا اور علما کے کتب خانوں کا ذکر کریں گے جو قرونِ وسطیٰ میں ہندوستان میں مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں قائم ہوئے۔

کتب خانہ سلطان محمود غزنوی (متوفی ۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء)

سلطان محمود غزنوی نہ صرف عالم تھا، بلکہ بقول امام مسعود بن شعبہ بہت بڑا فقیہ بھی تھا۔ اس نے کچھ کتابیں بھی تصنیف کیں، جن میں سے ایک "التفرید" فقہ کی کتاب ہے جو غزنہ اور اس کے گرد و نواح میں متداول رہی[۵۷]۔ سلطان چونکہ خود عالم اور علما کا سرپرست تھا، اس لیے اس کے دربار میں جس قدر اہلِ علم، شعرا اور دیگر مشاہیرِ روزگار جمع ہوئے تھے شاید ہی کسی اور شاہی دربار میں جمع ہوئے ہوں، اسی لیے پروفیسر براؤن سلطان کو "اغوا کنندہ علما" لکھتے ہیں۔ سلطان ان پر چار لاکھ دینار سالانہ خرچ کرتا تھا[۵۸]۔

سلطان محمود کو سخن فہمی میں بھی کمال حاصل تھا، کالنجر کے راجا نے جب سلطان کی خدمت میں مدحیہ شعر لکھ کر بھیجے تو سلطان نے راجا کو انعام کے طور پر کالنجر اور پندرہ دیگر قلعوں کی حکومت سونپ دی[۵۹] اور جب سلطان کو قنوج کی فتح نصیب ہوئی تو اس نے تحدیثِ نعمت کے طور پر ایک جامع مسجد اور ایک عظیم الشان مدرسہ بنوایا اور مدرسے کے ساتھ نہایت قیمتی اور نادر کتب پر مشتمل ایک

---

۵۵ اطہر مبارک پوری، قاضی۔ ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں (دہلی، ندوۃ المصنفین، ۱۹۶۷ء) ص ۱۵۰

۵۶ ابوالحسنات ندوی۔ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں (امرتسر، الیکٹرک پریس ہال بازار، ۱۳۴۱ھ) ص ۱۹،۱۸

۵۷ عبدالحی، مولانا۔ نزہۃ الخواطر، ترجمہ ابو یحییٰ امام خان نوشہروی (لاہور، مقبول اکیڈمی، ۱۹۶۵ء) ج ۱، ص ۵۶

۵۸ مستوفی، قزوینی، حمید اللہ بن ابوبکر بن حامد بن ظفر تاریخ گزیدہ ترجمہ ایلیٹ دی ہسٹری آف انڈیا ایز ٹولڈ بائی اٹس اون ہسٹورینز (لاہور، اسلامک بک سروس، ۱۹۷۶ء) ج III، ص ۶۳

۵۹ سبحان رائے بٹالوی۔ خلاصۃ التواریخ مترجمہ ناظر حسن زیدی (لاہور، مرکزی اردو بورڈ، ۱۹۶۶ء، ص ۳۰

کتب خانہ قائم کیا[۱۰] اور پھر اس کتب خانے کو اس وقت چار چاند لگ گئے جب "رے اور بخارا پر قبضے کے نتیجے میں عضد الدولہ دیلمی، مشہور وزیر صاحب بن عباد اور نوح بن منصور کے شہرہ آفاق کتب خانے، جو انھوں نے خون پسینہ ایک کر کے جمع کیے تھے، اس (سلطان) کے ہاتھ لگے[۱۱]

سلطان محمود کے بعد اس کا بیٹا سلطان مسعود تخت نشین ہوا، لیکن ہمیں سلطان مسعود کے کتب خانے کا صراحت سے کوئی ذکر نہیں ملتا، تاہم قدیم و جدید محققین کی آرا کی روشنی میں وہ سلطان محمود کے تخت کے ساتھ ساتھ اس کے کتب خانے کا بھی وارث تھا۔ چنانچہ پروفیسر لا لکھتے ہیں کہ "مسعود دراصل محمود کا صحیح جانشین تھا، جس نے باپ کی روایات کو قائم رکھا۔ اس کے زمانے میں نہ صرف عربی اور فارسی ادب نے ترقی کی بلکہ سنسکرت اور یونانی ادب کی قیمتی تصنیفات سے بھی استفادہ کیا گیا۔ مشہور مؤرخ فرشتہ مسعود کو سخی، خوش اخلاق اور علما و فضلا کا قدر دان لکھتا ہے۔ اسی قدر دانی کا نتیجہ تھا کہ ابو ریحان منجم نے اپنی تصنیف "قانون مسعودی" اور ابو محمد ناصحی نے اپنی کتاب "کتاب مسعودی" اسی کے نام معنون کی ہے۔

سلطان محمد غوری (متوفی ۶۰۲ھ/ ۱۲۰۵ء)

ہر چند کہ سلطان محمد غوری کا زیادہ وقت جہاد میں گزرا، لیکن اسے جب بھی فرصت ملی اس نے دینی علوم کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ اجمیر کی فتح پر سلطان نے بت پرستی کے خاتمے کے لیے مندروں کو نیست نابود کیا۔ ان کی جگہ مساجد اور جامعات قائم کیں اور اسلامی نظریے اور قانون کو نافذ کیا۔[۱۲] غالباً اسی واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر بمل کمار دت لکھتا ہے کہ "محمد غوری اور کچھ دیگر سلاطین مثلاً قطب الدین ایبک اور بختیار نے جاہلانہ تعصب کی وجہ سے ہندو اور بدھی تعلیمی مرکزوں، مندروں، عبادت گاہوں، درس گاہوں اور کتب خانوں کو تباہ کیا۔ لیکن اس تباہی کی تلافی انھوں نے اس طرح

۱۰؎ فرشتہ، محمد قاسم حوالہ سابقہ ج ۱، ص ۹۴

۱۱؎ آفتاب اصغر (ڈاکٹر) "برصغیر کے قدیم اسلامی کتب خانے" المعارف" (لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ ۱۹۸۲ء) جلد ۱۵ شمارہ ۷، ص ۷

۱۲؎ حسن نظامی۔ تاج المآثر مترجمہ ایلیٹ حوالہ سابقہ ج ۲، ص ۲۱۵

کی کہ مسجدیں، کالج اور کتب خانے بنوائے ۹ یہی شواہد سلطان محمد کی علم پسندی کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس کی علم دوستی کا یہ حال تھا کہ باوجود مقتدر فرماں روا ہونے کے ہمیشہ علما اور اولیا کی صحبت میں بیٹھتا اور ان کی عزت و تکریم کرنا سعادت دارین جانتا تھا۔ اس لیے ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ سلطان نے علم کی اشاعت کے لیے یقیناً شان دار کتب خانے بھی قائم کیے ہوں گے۔

سلطان قطب الدین ایبک (متوفی ۶۰۷ھ/ ۱۲۱۰ء)

یہ سلطان خاندانِ غلاماں کا بانی ہے۔ اسے بچپن میں ترکستان سے لایا گیا اور نیشاپور میں بطور غلام قاضی فخر الدین کے ہاتھ فروخت کیا گیا۔ اس نے قاضی صاحب کی توجہ سے بچپن میں علم و ادب کی قدر و منزلت کو خوب جان لیا تھا یہی وجہ ہے کہ جب قیدِ غلامی سے تختِ شاہی پر متمکن ہوا تو اس نے اشاعتِ علم کے لیے ہزاروں مساجد تعمیر کرائیں۔ سلطان نے صرف بنارس میں ایک ہزار مساجد بنوائیں[۱۳] یہ مساجد عہدِ وسطیٰ کے یورپی گرجا گھروں کی طرح مذہب اور تعلیم بیک وقت دونوں کا مرکز تھیں۔

جہاں تک سلطان کے کتب خانوں کے قیام کا تعلق ہے۔ ڈاکٹر بمل کمار دت جیسا ہندو مصنف جو سلطان کو جاہلانہ تعصب کا حامل قرار دیتا ہے، اس کا اعتراف کرتا ہے کہ سلطان نے مساجد، کالج اور کتب خانے بنوائے تاکہ اسلامی تعلیم اور مذہب کی اشاعت ہو۔ ملک کے مختلف مقامات پر مساجد، کالج اور کتب خانے قائم کرنے والے سلطان سے متعلق یہ سوچنا قرین قیاس نہیں کہ اس نے شاہی محل اور شاہی محل سے متصل مسجد قوت الاسلام کے ساتھ کتب خانے قائم نہیں کیے ہوں گے۔

سلطان شمس الدین التمش (متوفی ۶۳۳ھ/ ۱۲۳۶ء)

اس سلطان کے عہد میں کتب خانے قائم تھے۔[۱۴] سلطان بیرونِ ہند سے اچھی اچھی کتابیں منگوا کر اس ملک کے علمی خزائن (کتب خانوں) کو مالا مال کیا کرتا تھا۔[۱۵] سلطان کی علم دوستی اور مساجد و مدارس

---

۱۳ حسن نظامی۔ تاج المآثر مترجمہ ایلیٹ، ج ۲، ص ۲۲۳

۱۴ محمد زبیر۔ محولہ بالا، ص ۱۷۸

۱۵ شیخ محمد اکرام، آب کوثر (لاہور، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، ۱۹۷۹ء)، ص ۱۱۶

کی تعمیر بھی اس بات کی واضح شہادت دیتی ہے کہ اس نے مساجد اور مدارس کے ساتھ اس دور کے رواج کے مطابق کتب خانے بھی قائم کیے۔ اس نے سب سے پہلے دہلی میں ایک عظیم الشان مدرسہ بنوایا اور اسے اپنے ولی نعمت سلطان شہاب الدین غوری کے اصل نام معز الدین محمد کی نسبت سے مدرسہ معزیہ کے نام سے موسوم کیا۔ اس کے علاوہ صرف دہلی میں متعدد مدارس قائم کیے۔ علم کی اشاعت کے لیے اس نے تخت نشین ہوتے ہی نامور بزرگوں، سادات اور علما و امرا کو اپنے دربار میں اکٹھا کرنا شروع کیا۔ سلطان ان پر ہر سال دس کروڑ سے زائد رقم خرچ کرتا تھا[16]۔ یہ امرا درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ درس و تدریس کے علاوہ سلطان کی زیر سرپرستی فضلا اور انشاپردازوں کی ایک پوری جماعت تصنیف و تالیف سے امرا و عوام کی علمی پیاس بجھا رہی تھی اور یہ علمی ذخائر مرتب و محفوظ رکھنے کے لیے کتب خانوں کا قیام ایک فطری امر تھا۔

سلطان ناصر الدین محمودؒ (متوفی ۶۶۴ھ/ ۱۲۶۶ء)

سلطان ناصر الدین محمود نے اپنے بیس سالہ دور حکومت میں تعلیم کو فروغ دیا۔ اس کے دور میں جالندھر کے مقام پر ایک جامعہ (یونیورسٹی) قائم ہوئی۔ علاوہ ازیں انھوں نے بے شمار مساجد خانقاہیں اور سرائیں بنوائیں۔ چنانچہ مساجد، خانقاہوں اور جامعہ کے ساتھ کتب خانے بھی یقیناً قائم کیے ہوں گے، لیکن ان کا ذکر علیحدہ اس لیے نہیں ملتا کہ کتب خانوں کے لیے الگ عمارات تعمیر نہیں کی جاتی تھیں، بلکہ تعلیمی ادارے، مساجد اور خانقاہیں ہی ایسی جگہیں تھیں جہاں کتابوں کو محفوظ کیا جاتا تھا۔ سلطان کے عہد میں کتب خانوں کے قیام کی مزید توثیق اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ سلطان کو کتابوں سے عشق تھا اور جس چیز سے عشق ہو، اس کی حفاظت ایک فطری امر ہے۔

سلطان چونکہ عالم اور درویش حکمران تھا، اس لیے علما اور صوفیا کو دوست رکھتا تھا اور ان کی بے حد تعظیم و تکریم کرتا تھا۔ علما کا یہ گروہ درس و تدریس کے علاوہ تصنیف و تالیف بھی کرتا ہوگا، جب کہ سلطان نے خود اپنے ذاتی مصارف کی کفالت کے لیے کتابت کا پیشہ اختیار کر رکھا تھا۔ بادشاہ ہر سال دو قرآن مجید اپنے ہاتھ سے نقل کرتا تھا۔ ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ "قاضی

---

[16] منہاج سراج، طبقات ناصری، ترجمہ غلام رسول مہر (لاہور، مرکزی اردو بورڈ، ۱۹۷۵ء)، ص ۸۳،

کمال الدین نے اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن شریف مجھ کو دکھایا، جس کا خط اچھا تھا اور کتابت پختہ تھی[17]۔ کتابت کے سلسلے میں سلطان کا ایک واقعہ جو احترامِ آدمیت کے متعلق ہے، آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ ایک دفعہ بادشاہ کتابتِ قرآن میں مشغول تھا کہ ایک سائل حاضر ہوا، اس کی نگاہ کھلے ہوئے صفحے کی اس سطر پر پڑی جہاں "فیہ فیہ" مکرر لکھا ہوا تھا، سائل نے کہا کہ ایک "فیہ" زائد ہے۔ بادشاہ نے فوراً قلم دوات لے کر ایک "فیہ" کے گرد دائرہ کھینچ دیا، لیکن جب سائل چلا گیا تو بادشاہ نے وہ دائرہ مٹا دیا۔ خادم جو پاس کھڑا یہ تماشہ دیکھ رہا تھا، عرض پرداز ہوا کہ دائرے کو مٹانے میں کیا حکمت ہے؟ بادشاہ نے کہا "فیہ فیہ" یہاں دو مرتبہ لکھنا ہی درست ہے۔ مگر سائل کا دل رکھنے کے لیے میں نے ایک "فیہ" کے گرد دائرہ کھینچ دیا۔ اب لفظ کا احاطہ کرنے والا دائرہ مٹانا آسان ہے، بہ نسبت اس دائرے کے جو سائل کی بات نہ مانتا تو اس کے دل پر پڑ جاتا۔

کتب خانہ سلطان غیاث الدین بلبن (متوفی ۶۸۵ھ / ۱۲۸۶ء)

بادشاہ بننے سے قبل غیاث الدین بلبن جہاں خوش آواز کتاب خواں کو نوازتا تھا، وہاں شیریں زبان ندیموں اور گانے والوں کی بھی پرورش کرتا تھا۔ لیکن بادشاہ ہونے کے بعد تو علما کی موجودگی کے بغیر کھانے کی طرف بھی ہاتھ نہ بڑھاتا، اور کھانے کے دوران بھی علما سے دین کے مسائل دریافت کیا کرتا[18]۔ یہی وجہ ہے کہ سلطان کے عہد میں کمینہ خصلت اور نااہل اشخاص کے لیے گوشۂ گمنامی مقدر ہوا اور نیک و سعادت مند افراد کا بول بالا ہوا[19]۔ علما کی صحبت اور دین سے محبت کے نتیجے میں سلطان نے مساجد، مدارس اور کتب خانے قائم کیے تاکہ اسلامی تعلیم اور مذہب پھیلے۔ دیگر کتب خانوں کے علاوہ سلطان نے شاہی کتب خانہ بھی قائم کیا جو اس کے علمی شغف اور عالی مرتبت درباری علما کی شب و روز جد و جہد کی بدولت بڑی ترقی کر گیا تھا۔

---

[17] ابن بطوطہ۔ سفرنامہ ابن بطوطہ مترجم رئیس احمد جعفری (کراچی، نفیس اکیڈمی، ۱۹۷۷ء)، ص ۵۳

[18] ضیاء الدین برنی۔ تاریخ فیروز شاہی مترجم معین الحق (لاہور، مرکزی اردو بورڈ، ۱۹۶۹ء)، ص ۱۹۳

[19] ابوالفضل۔ آئین اکبری ترجمہ محمد فدا علی طالب (لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ت ن)، ص ۵۳

کتب خانہ حضرت نظام الدین اولیا (متوفی ۷۲۵ھ/ ۱۳۲۵ء)

محمد بن احمد بن علی البخاری نے سلطان المشائخ، سلطان جی، سلطان الاولیا، سلطان السلاطین اور نظام الدین اولیا جیسے القاب سے شہرت پائی اور محبوب الٰہی کے نام سے یاد کیے گئے۔ آپ کا شمار اولیائے کبار میں ہوتا ہے۔ آپ بھٹکی ہوئی انسانیت کو راہ حق دکھانے کے لیے شب و روز کوشاں رہتے۔ اس خدمت کے لیے علم کی شدید ترین ضرورت ہوتی ہے، اور کتب خانے ہی الہامی اور اکتسابی علوم کے خزینے ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرت نظام الدین اولیا نے بھی اس ضرورت کے پیش نظر ایک شاندار کتب خانہ قائم فرمایا۔[۲۰] ان کا کتب خانہ دہلی کے علاقہ غیاث پورہ میں قائم ہوا جو آج بھی موجود ہے۔ یہ کتب خانہ شروع ہی سے وقف عام تھا، جس سے اشراف و اکابر اور علما و عوام سب مستفید ہوتے تھے۔ لوگ زیادہ تر سلوک کی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے اور بعض بزرگ تو کتابیں ساتھ بھی لے جاتے تھے۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے شیخ سراج الدین عثمانی گوری کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے مولانا رکن الدین سے کفایہ مفصل، قدوری، مجمع البحرین بخوبی پڑھیں اور شیخ نظام الدین اولیا کی وفات کے بعد بھی تین سال تک دیگر علوم حاصل کرتے رہے اور بعد ازاں شیخ کے وقف کتب خانے سے کچھ کتابیں، کپڑے اور شیخ سے حاصل کردہ خلافت نامہ اپنے ساتھ لے گئے۔[۲۱]

کتب خانہ سلطان جلال الدین خلجی (متوفی ۶۹۵ھ/ ۱۲۹۵ء)

سلطان جلال الدین خلجی کا علمی ذوق بہت نمایاں تھا۔ وہ علما کی خاطر خواہ قدر و منزلت کرتا، جس سے شاہی دربار میں ایسا علمی ماحول پیدا ہو گیا تھا جو اس سے قبل مفقود تھا۔ امیر خسرو نے بحیثیت شاعر، شہزادہ محمد بن بلبن کی ملازمت سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا اور شہزادے کی وفات کے بعد سلطان بلبن سے سلطان غیاث الدین تغلق تک متعدد سلاطین کی زیر سرپرستی رہے اور پھر سلاطین اور امرا کی قدردانی اور حوصلہ افزائی کے پیش نظر دہلی میں جو علمی ماحول پیدا ہوا، امیر خسرو

۲۰۔ عبد المجید سالک۔ مسلم ثقافت ہندوستان میں (لاہور، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۵۷ء)، ص ۱۹۲

۲۱۔ عبد الحق، محدث دہلوی۔ اخبار الاخیار ترجمہ مولانا اقبال الدین احمد (کراچی، دار الاشاعت، ۱۹۶۸ء)، ص ۱۶۳

بڑے فخر کے ساتھ اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ دہلی دانش وری میں وسط ایشیا کی مشہور جامعہ بخارا کی ہم سر ہے۔

سلطان بلبن کے عہد میں متعدد مساجد، کالج اور کتب خانے قائم ہوئے۔ عام کتب خانوں کے علاوہ سلطان نے شاہی کتب خانے کی تعمیر و ترقی میں مؤثر اقدام کیا۔ ان میں سب سے اہم قدم امیر خسروؒ کو بطور مصحف بردار اور ناظم کتب خانہ تعینات کرنا تھا۔[۲۲]

کتب خانہ سلطان علاء الدین خلجی (متوفی ۷۱۶ھ/ ۱۳۱۶ء)

اس میں شک نہیں کہ سلطان آغاز میں ناخواندہ تھا، لیکن اس نے اپنی ناخواندگی کو شدت سے محسوس کیا اور پوشیدہ طور پر تعلیم حاصل کرنا شروع کی اور جلد ہی فارسی زبان میں اتنی استعداد پیدا کر لی کہ خطبات پڑھ کر سنانے اور بہترین مصنفین کی کتابیں پڑھنے کے قابل ہو گیا۔ ظاہر ہے اسی دوران میں سلطان نے شاہی کتب خانے سے بھرپور فائدہ اٹھایا، اور اس کی ترقی کے لیے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اور پھر کثیر علما کا وجود بھی کثیر ذخیرۂ کتب کے وجود پر دلالت کرتا ہے۔ برنی کا قول ہے کہ دارالحکومت دہلی بے نظیر شخصیتوں کے وجود سے ایک عظیم شہر بن گیا تھا۔ درحقیقت دہلی ان ایام میں رشکِ بغداد، غیرتِ مصر اور ہمسرِ قسطنطنیہ اور بیت المقدس تھا۔

سلطان علاء الدین نے اپنے عہد میں حوض خاص سے متصل ایک بڑا مدرسہ قائم کیا۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے لکھا ہے کہ مدرسۂ علائی کے دروازے کے نقوش اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ سلطان نے علم و ادب کو ترقی دی، نیز اس نے کالجوں (اعلیٰ مدارس) کے ضوابط بنائے۔ اور عبادت گاہوں کو استحکام بخشا۔ یہی وجہ ہے کہ جس کثرت سے مساجد، خانقاہیں اور حوض علاء الدین نے تعمیر کرائے کسی اور بادشاہ کے زمانے میں تعمیر نہیں ہوئے۔

بختیار خلجی (متوفی ۶۰۲ھ/ ۱۲۰۵ء)

بختیار خلجی کا پہلا حملہ بہار میں واقع بدھ مذہب کی خانقاہی درس گاہ پر ہوا جو بدھ طلبا اور راہبوں سے معمور تھی اور یہاں عمدہ کتب خانے بھی تھے۔ اس کے بعد بختیار نے اپنی تخریبی کاروائی

---

[۲۲] ضیاء الدین برنی۔ تاریخ فیروز شاہی ترجمہ: غلام علی طالب (لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ت۔ن)، ص ۲۰۵

کی جزوی تلافی اس طرح کی کہ مسلمانوں کی تعلیمی ترقی اور اشاعتِ دین کے لیے ملک کے مختلف حصوں میں مساجد، دانش گاہیں اور خانقاہیں تعمیر کرائیں۔ بختیار خلجی کو بہار کی فتح کے موقع پر ہندوؤں کی کتابیں بھی دستیاب ہوئیں لیکن ان کتابوں کے پڑھنے والا اور سمجھانے والا کوئی نہیں ملا۔

بختیار خلجی کے عہد میں اگرچہ کتب خانوں کی تفصیل نہیں ملتی۔ تاہم یہ طے شدہ امر ہے کہ بختیار کے عہدِ حکومت میں کتب خانے قائم ہوئے، چنانچہ ڈاکٹر بمل کمار دت طبقات ناصری کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ "اس نے مساجد، کالج اور کتب خانے بنوائے تاکہ اسلامی تعلیم اور مذہب پھیلے۔

سلطان محمد بن تغلق (متوفی ۷۵۲ھ/۱۳۵۰ء)

اس میں شک نہیں کہ سلطان محمد بن تغلق متضاد صفات کا مالک تھا، چنانچہ مشہور مؤرخ فرشتہ کا بیان ہے کہ اگر موروثی اسلام مانع نہ ہوتا تو یہ بادشاہ شاید فرعون کی طرح خدائی کا دعویٰ کرتا لیکن دوسری طرف وہ اسلام کی پوری پوری پیروی کرتا تھا، یہاں تک کہ فرض، سنت، نفل و مستحب کا پابند تھا۔ محمد تغلق کو فلسفہ اور معقولات کے تمام علوم سے عموماً اور نجوم وطب، ریاضی اور منطق سے خصوصاً دلچسپی تھی۔ وہ فارسی کا بہت اچھا شاعر تھا اور پرانے شعرا کے کلام کو خوب سمجھتا تھا۔[۲۳] دینی علوم کا یہ حال تھا کہ قرآن عزیز اور حنفی مسلک کی مشہور کتاب الهدایہ زبانی یاد تھی۔[۲۴] کیا اتنے علوم و فنون میں مہارت رکھنے والا بادشاہ اپنے علمی و ادبی ذوق کی تسکین کتب خانے کے بغیر کرتا ہوگا؟ جب کہ اسے کتابیں پیش کرنے والے بیش قیمت انعامات سے نوازے جاتے تھے۔ ایک شخص نے ابن سینا کی کتاب کا نسخہ پیش کیا تو اس کے عوض سلطان نے دو مثقال یا اس سے بھی زیادہ سونا دیا۔ اس علم پروری کی بنا پر مدارس کے کتب خانوں میں طرح طرح کی کتابوں کا اضافہ ہوتا رہا۔

کتب خانہ سلطان فیروز تغلق (متوفی ۷۹۰ھ/۱۳۸۸ء)

سلطان فیروز تغلق نہایت درجہ عالم اور فاضل بادشاہ تھا۔ تاریخ فیروز شاہی اس کی لیاقت

۲۳ھ فرشتہ، محولہ بالا، ج ۲، ص ۱۰، ۱۱

۲۴ھ ابوالعباس، شہاب الدین مسالک الابصار فی ممالک الامصار۔ ترجمہ ایلیٹ ج ۳، ص ۵۸۰

کا زندۂ جاوید ثبوت ہے۔ چونکہ سلطان خود عالم تھا، اس لیے اس نے اپنے دور کے تمام علوم کو ترقی دینے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا اور اپنے دربار میں آنے والے کسی ہندوستانی یا غیر ہندوستانی عالم کو نظرانداز نہ کیا۔ سلطان کے عہد میں مدارس اور مساجد طلبا سے معمور تھے اور علم کا چرچا عام ہوگیا تھا۔ اساتذہ کو ہزاروں گاؤں بطور انعام ملے۔ عام طلبا کے علاوہ سلطان کے اپنے غلاموں میں سے بعض تو ہر وقت تلاوت و حفظِ قرآن میں مشغول رہتے جبکہ بعض غلام علم کے حصول میں معروف تھے۔ اور بعض کتابوں کو نقل کرنے پر مامور۔[۲۵]

سلطان نے شاہی محل کے تمام امور کو علیحدہ علیحدہ شعبوں میں بانٹ رکھا تھا، اور ہر شعبہ کارخانہ کہلاتا تھا۔ ہر شعبے کا نگران کوئی امیر مملکت ہوتا جسے بادشاہ خود مقرر کرتا تھا۔ ان شعبوں میں سے ایک شعبہ کتب خانہ بھی تھا جو "علم خانہ" کے نام سے موسوم تھا۔ اس کتب خانے کا ناظم مشہور مؤرخ عفیف کا چچا تھا۔ سلطان کو کتابوں سے بے حد محبت تھی، چنانچہ سلطان نے جب نگرکوٹ فتح کیا اور سلطان کو اس کا علم ہوا کہ جوالا مکھی نامی کتب خانے میں تیرہ سو کتابیں بھی موجود ہیں تو سلطان نے ان کو اپنے کتب خانے میں منتقل کیا اور برہمنوں سے کچھ کتابوں کے تراجم کرائے۔ فیروز شاہ کے عہد کے ایک مشہور شاعر اعزالدین خالد ثانی نے حکمت طبعی اور شگون و فال کی ایک کتاب کا فارسی زبان میں منظوم ترجمہ کیا، اور اپنی اس تالیف کو "دلائل فیروز شاہی" کے نام سے موسوم کیا۔ "الناس علیٰ دین ملوکھم" کے مصداق اس دور میں مسلمان امرا و وزرا کے علاوہ ہندو راجاؤں نے بھی اپنے اپنے کتب خانے قائم کیے۔

کتب خانہ تاتار خاں

تاتار خاں سلطان غیاث الدین کے عہد کا مشہور امیر ہے، وہ جہاں عدل و شجاعت میں مشہور تھا وہاں علم و کمال میں بھی ممتاز تھا۔ تاتار خاں نے علما کے ایک گروہ کو اکٹھا کیا اور اس وقت تک لکھی گئی تفاسیر کو بھی جمع کیا۔ علمائے کرام کی علمی معاونت سے ایک تفسیر مرتب کی جس میں آئمہ تفاسیر کے اختلافات کو ان کے نام کے ساتھ جمع کیا۔ تاتار خاں نے اپنی تفسیر "تفسیر تاتار خانی" کی تالیف

---

[۲۵] شمس سراج عفیف۔ تاریخ فیروز شاہی ترجمہ ایلیٹ جلد ۳ ص ۳۴۱

میں دل وجان سے کوشش کی۔ علاوہ ازیں تاتارخاں نے ایک مجموعۂ فتاوی بھی مرتب کیا جو تقریباً تیس جلدوں پر مشتمل تھا۔

ایک انگریز ادیب سیموئیل جانسن نے خوب کہا ہے کہ ایک کتاب تصنیف کرنے میں تقریباً آدھے کتب خانے کو کھنگالنا پڑتا ہے، چنانچہ تاتارخاں نے بھی اپنی دو عظیم الشان تالیفات اپنے شاندار کتب خانے کی مدد سے تیار کیں۔ تاتارخاں کی ایک ذاتی لائبریری بھی تھی جس میں فتاوے کے موضوع پر بے شمار قیمتی کتابیں موجود تھیں۔

سلطان بہلول لودھی (متوفی ۸۹۴ھ/ ۱۴۸۸ء)

لودھی خاندان کا یہ پہلا بادشاہ تھا، وہ اپنا بیشتر وقت حکما اور علما کی صحبت میں گزارتا تھا اور غربا و مستحقین سے متعلق خصوصی معلومات حاصل کرتا تھا۔ اس نے کسی ضرورت مند کو کبھی نہیں ٹالا۔ وہ نماز پنجگانہ ہمیشہ عوام کے ساتھ باجماعت ادا کرتا تھا۔ سلطان سفر و حضر میں عالموں اور درویشوں کے ساتھ رہتا۔ پروفیسر لا لکھتا ہے کہ سلطان موصوف کے عہد میں امن و امان قائم ہوا اور اس کے ساتھ ہی مملکت کی طرف سے علمی ذوق اور تعلیمی ترقی کی ہمت افزائی بھی شروع ہوگئی۔ "مآثر رحیمی" سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے چند جامعات تعمیر کیں۔ یہ یقینی امر ہے کہ اس دور کی روایت کے مطابق جامعات کے ساتھ کتب خانے بھی قائم کیے ہوں گے۔ نیز شاہی کتب خانے نے بھی سلطان کے زمانے میں خوب ترقی کی ہوگی۔

کتب خانے اور سلطان سکندر لودھی (متوفی ۹۲۳ھ/ ۱۵۱۷ء)

سلطان سکندر کے پاس ایک شاہی کتب خانہ بھی تھا اور اس زمانے میں ملک میں اور بھی بے شمار کتب خانے وجود میں آئے۔ اس کے امرا اور درباریوں نے بھی اپنے اپنے کتب خانے قائم کیے۔ ان میں سے غازی خاں کا کتب خانہ قابل ذکر ہے، غازی خاں کے علاوہ اس کا ایک اور امیر میاں بدھا تھا، وہ کچھ کتابیں خراسان سے لایا اور علما و صلحا کو دیں۔ سلطان کی زیر سرپرستی علما ہمیشہ کتابوں کے تراجم میں لگے رہتے۔ اس نے خراسان اور ہندوستان کے تمام اطبا کو جمع کیا اور طب سے متعلق بہت سی کتابیں اکٹھی کیں۔ چنانچہ سلطان کے عہد میں طب کی ارکرحہایدک نامی کتاب کا ترجمہ کیا گیا جس نے طب سکندری کا نام پایا۔ اس سے زیادہ مستند کتاب پورے ہندوستان میں نہیں ہے۔[۵۵] سلطان

بہترین شاعر تھا اور گلرخی تخلص کرتا تھا۔[۲۷] سلطان نے علم و ادب کی ہر لحاظ سے حوصلہ افزائی کی۔ اس نے ملک کے ہر حصے میں مدارس قائم کیے اور آگرہ کے کالجوں میں ممتاز علما کا تقرر کیا۔ اس نے اپنی فوج کے افسروں کے لیے تعلیم لازمی قرار دی۔ ہندوؤں نے فارسی تعلیم حاصل کرنا اسی کے عہدِ حکومت میں شروع کیا تھا۔[۲۸]

مدارس اور کالجوں کا قیام اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ان کے ساتھ کتب خانے بھی قائم ہوئے ہوں گے، کیوں کہ کتب خانے تعلیمی اداروں کے لیے ہمیشہ سے روحِ رواں کا درجہ رکھتے ہیں۔

کتب خانہ غازی خاں

غازی خاں عہد سکندری کا ایک امیر تھا۔ مؤرخ فرشتہ کا بیان ہے کہ غازی خاں ایک جید عالم تھا اور شاعری کا بہترین مذاق رکھتا تھا۔ اس نے ہر موضوع کی عمدہ کتابیں خوش خط لکھوا کر اپنے کتب خانے میں جمع کی تھیں۔[۲۹] یہ کتب خانہ دہلی کے قلعے میں تھا جس پر بابر نے ۱۵۲۵ء میں ہندوستان کی فتح کے موقع پر قبضہ کیا۔ تزکِ بابری میں لکھا ہے کہ میں نے غازی خاں کے کتب خانے کا معائنہ کیا اور اس میں مفید کتابوں کی ایک بڑی تعداد پائی۔ اس کے علاوہ مذہب سے متعلق بھی بہت کتابیں ملیں۔ بابر نے کتب خانے کے حصے بخرے کر کے کئی لوگوں کی علمی کفالت کی۔ اس کا ایک حصہ شہزادہ ہمایوں کو دیا۔ کچھ کتابیں کامران مرزا کے لیے کابل بھجوائیں اور کچھ کتابیں اپنے لیے رکھیں۔

کتب خانہ سید ابراہیم دہلوی (متوفی ۹۵۳ھ/ ۱۵۴۶ء)

سکندر لودھی کے عہد کے ایک غیر مشہور عالم دین سید ابراہیم تھے۔ وہ دانش مند، فلسفی، تمام علوم عقلی و نقلی کے ماہر اور کثیر المطالعہ بزرگ تھے۔ انھوں نے بہت سی کتابوں کی تصحیح بھی کی۔ مزید برآں انھوں نے مشکل کتابوں کے مشکل مضامین کو سلیس زبان میں پیش کیا۔ غرضیکہ وہ دہلی کے یکتائے روزگار عالم تھے۔ ان کا ایک بہت بڑا کتب خانہ بھی تھا۔ جب ان کا انتقال ہوا

---

[۲۷] فرشتہ، ج ۲، ص ۱۶۲

[۲۸] ابوالحسنات ندوی۔ ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں۔ ص ۳۶

[۲۹] فرشتہ، ج ۲، ص ۲۰۶

ان کے کتب خانے سے کثیر تعداد میں کتابیں برآمد ہوئیں اور ان میں سے اکثر ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھیں۔[۳۰]

تب خانہ شیخ سعد اللہ متوفی (۹۱۷ھ / ۱۱۵۱)

شیخ سعد اللہ بھی سکندر لودھی کے دور کے عالم تھے جو ایک صاحبِ دل بزرگ تھے۔ کتابوں
ے بے حد شائق تھے، ان کی ایک قابلِ قدر لائبریری تھی۔

تب خانے اور سلاطین کشمیر

سلاطینِ دہلی کی طرح سلاطینِ کشمیر بھی علم و ادب کے دل دادہ تھے۔ انھوں نے علوم کی سرپرستی
۔ اس سلسلے میں سلطان زین العابدین قابلِ ذکر ہیں، جنھوں نے اشاعتِ علم کے لیے اپنے محل
ے ساتھ ایک مدرسہ قائم کیا اور مولانا کبیر کو اس کا مہتمم بنایا۔ سلطان گاہے بگاہے مولانا کا درس
ننے جاتا اور مدرسے کے مستحق طلبا کو وظائف دیتا تھا۔ اس مدرسے کے علاوہ سلطان نے بہت
سے ادبی ادارے اور کتب خانے قائم کیے۔ سلطان نے ایک تکنیکی سکول بھی قائم کیا جس میں طلبا
کاغذ سازی، جلد سازی اور دیگر فنون سیکھتے تھے۔

زندہ اقوام کی ہمیشہ یہ روایت رہی ہے کہ وہ نہ صرف اپنے اسلاف کے قائم کردہ کتب خانوں
اور علمی ورثوں کی حفاظت کرتی ہیں بلکہ ان میں معتدبہ اضافہ کرکے آنے والی نسلوں تک پہنچانے کا اہتمام
بھی کرتی ہیں جو اس سے استفادہ کرتی ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے حال کا ماضی کے آئینے
میں جائزہ لیتی ہیں کہ کیا وہ اپنے نظریۂ حیات کے مطابق صحیح راہ پر گامزن ہیں یا نہیں۔ آج ہم جس
مقام پر کھڑے ہیں، اس کے پیشِ نظر ہمیں انفرادی طور پر جائزہ لینے کی ضرورت ہے کیوں کہ ہمیں
نہ صرف اپنے اسلاف کی روایات کو قائم رکھنا چاہیے بلکہ انسانیت کے بھٹکے ہوئے قافلوں
کی رہنمائی بھی کرنی چاہیے۔

۳۰ـہ عبدالحق، محدث دہلوی اخبار الاخیار فی اسرار الابرار (دہلی، مطبع مجتبائی، ۱۳۳۲ھ)، ص ۲۵۰